تو یہ تھا اقبال!

قدرت نے اسے جس بڑے مقصد کے لیے ایک موثر و مقبول شخصیت بنایا۔ آج عالم اسلام میں لوگ قافلہ در قافلہ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس پورے کے پورے اقبال کو، اور اصل اقبال کو سامنے رکھ کر کوئی بتائے کہ کیسے اسے اشتراکی یا اسلامی سوشلزم کا داعی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ رسولِ پاک کو جو مقام دیتا ہے وہ تاریخ اسلام کی جن درخشاں شخصیتوں کو اپنے فخرِ احترام میں سجا کر پیش کرتا ہے، اس نے زندگی میں جن لوگوں سے تعلق رکھا، جو اس کے دوست اور غمخوار تھے، جن لوگوں کو اس نے اپنا استاد و رہبر بنایا، جس طرح کے مشاغل رکھے، جن لوگوں سے وابستگیاں رکھیں، جس طرح کی زبان اور تراکیب کو پسند کیا، آخر ان ساری چیزوں کی شہادت کیا ہے۔

بہر حال مغالطہ انگیزوں کی اب تک کی مہمات جس طرح ناکام گئی ہیں، انشاء اللہ آئندہ بھی اقبال کی وسعت دار شخصیت کو کسی غلط سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکے گا۔

اور نہ یہی ممکن ہے کہ اس چھتنار درخت کے نیچے کوئی سرو و صنوبر پروان چڑھ سکے۔ اقبال کے مخالفین ہمیشہ احساس کہتری میں مبتلا رہیں گے۔

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ سرزمین پاکستان میں وہ کام کر ڈالا جائے جس کے لیے اقبال نے کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی" میں دن رات ایک کر دیے تھے۔ اور جسے ملت کا نصب العین اور برصغیر میں بننے والی مسلم ریاست کا مقصود قرار دیا تھا۔ کام تو ہو رہا ہے، مگر ایسے کام اگر سست رفتاری سے ہوں تو مخالف قوتوں کو ضرر رسانی کی مہلت مل جاتی ہے۔

آخری جملہ یہی ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے اس بندے پر ہزار در ہزار رحمتیں نازل کرے جس نے تہذیب مغرب کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔

---

(۳)

اگر کسی دَور کی تاریخ کا سارا عمل فطری طریق سے جاری ہو تو اسلامی نظامِ حیات اور اس کی برکات کا ظہور لازماً دعوتِ حق کے قدرتی برگ و بار کی صورت میں ہوتا ہے۔

جماعتِ اسلامی اقامتِ دین کے اسی فطری راستے کی داعی ہے اور اپنے طور پر وہ کئی سال سے بھرپور

کام اسی مقررہ نہج پر کر رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پختہ اور محکم کام کا راستہ یہی ہے۔ اس راستے پر کام کرتے ہوئے ہمیں باکسی اور قوت کو ہزار قسم کی مشکلات پیش آسکتی ہیں، بے شمار موانعات کا سامنا ہو سکتا ہے، سنگین آزمائشوں سے گذرنا پڑ سکتا ہے، مگر کلمہ طیبہ سے اُگنے والے شجرۂ طیبہ کو کسی طرح ختم نہیں کیا جا سکتا۔ خون اور لاشوں کی شکل میں جتنی قربانیاں پیش کی جاتی ہیں، وہ اُسے اور زیادہ نشوونما دیتی ہیں۔ وقتی طور پر اگر خونخوار جبریت اس مبارک پودے کو قطع بھی کر ڈالے تو بر پھر پھوٹ آتا ہے، اس کی جڑیں اور بیج کبھی مرتے نہیں، وہ صدیوں بعد بھی کونپل نکال سکتے ہیں۔ اس پودے کو کاشت کرنے والے بے مُزد کسان اپنے سامنے حکومتوں اور وزارتوں کو اُبھرتے اور مٹتے دیکھتے ہیں، جنگ و جدل کے سیلاب اس کے روبرو اُمڈتے ہیں، اقتصادی لحاظ سے کشادگی اور بحران کے بڑے بڑے دَور ان کی نگاہوں سے گذرتے ہیں، عالمی قوتوں کی ساز باز کے رنگارنگ کھیلوں کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں، مگر ان سارے حوادث کو اپنے خدائی کام کے بالمقابل وہ اس طرح دیکھتے ہیں جیسے گلیوں کے آوارہ بچوں کی حرکات ہوں۔

اقامتِ دین کا کام اگر اس فطری طریق پہ ایک بار پروان چڑھ جائے تو پھر اس کے آگے کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی۔ معاشرے کے اندر کی مزاحمتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور باہر کی شرپسند قوتیں بھی اپنے چنگال سمیٹ لیتی ہیں۔ فرد فرد کے اندر سے نور کا ایک چشمہ پھوٹ بہتا ہے، علمِ حق کی شعاعیں قریہ قریہ تک پھیل جاتی ہیں، جن لوگوں میں ایمان نہیں ہوتا ان میں ایمان پیدا ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کا ایمان حالتِ خواب میں ہوتا ہے وہ بیدار ہو کر متحرک قوت میں بدل جاتا ہے۔ زندگی کے جس شعبے میں دو چار افراد دعوتِ حق سے سرشار ہو جاتے ہیں وہ اپنے دائرے کے لوگوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتے، کسی بستی میں اگر ایک صاحبِ ایمان بھی موجود ہوتا ہے تو وہ وہاں دب سکڑ کر پڑا نہیں رہتا بلکہ گرد و پیش کے بحیرۂ منجمد کے ہر قطرے سے نور و حرارت کا طوفان اُٹھا دیتا ہے۔ وہ فرد دراصل فرد نہیں ہوتا، بلکہ پورے ملک میں پھیلی ہوئی تحریک اس کی پشت پہ ہوتی ہے اور ہزار ہا رفیقوں کی محبت و رفاقت اس کا سرمایۂ قوت ہوتی ہے۔

اقامتِ دین کی تحریک باطل سے ٹکراتی ہوئی جب آگے بڑھتی ہے تو قدم قدم پہ اس کا تنظیمی دائرہ بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب آخری مرحلہ آتا ہے تو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والا کوئی آدمی تن تنہا نہیں ہوتا کہ وہ دیانت داری سے خیر و فلاح کی باتیں کرنے کے عزائم باندھے، مگر اس کے دست و بازو نہ ہوں۔ نہیں، بلکہ صاحبِ اقتدار کے پیچھے شمار

چشم و گوش ہوتے ہیں جو ملک کے چپے چپے میں روزمرہ کے حوادث اور جمہور کی پریشانیوں کو دیکھتے ہیں، اس کے لاکھوں دماغ ہوتے ہیں جو دینِ برحق کے متعین خطوط پر مسائل و معاملات کو سوچتے اور لمحہ بہ لمحہ اپنے مشورے ایک مرکز پر پہنچاتے ہیں۔ اس کے کتنے ہی ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ وہ جہاں چل کر خود نہیں پہنچ سکتا، اس کے تحریکی ہمزاد بالکل بروقت وہاں پہنچ جاتے ہیں، اور جہاں جس کو سہارا دینا ہوتا ہے وہ درجنوں ہاتھ سہارا دینے کے لیے موجود ہوتے ہیں اور جہاں کسی ظالم کے ہاتھ کو پکڑنے کی ضرورت پیش آتی ہے، وہاں فوری طور پر بیسیوں ہاتھ ظالم قوت کے دست و پا کو ناقابلِ حرکت بنا دیتے ہیں۔ رشوت و خیانت کے واقعات ہوں تو ان پر نظر رکھنے والے رضاکار حاضر! چوری اور جرائم کا سلسلہ ہو تو مجرم کا راستہ روکنے کے لیے تیار۔ دفتری نظام میں بے قاعدگیاں اور بدعنوانیاں ہوں تو ان کا ازالہ کرنے کے لیے کمربستہ۔ آدمیوں کو پہچاننے کا مسئلہ ہو کہ کون حق کا ساتھ دینے والا، کون مزاحمت کرنے والا اور کون منافق ہے تو وہی رضاکار ایک ایک شخص کا ہسٹری شیٹ تیار کرنے کے لیے آن ڈیوٹی!

اسلام کی منظمانہ تحریک اپنے نفاذ کے لیے ایسی ہمہ گیر، فعال اور بابصیرت منظم قوت فراہم کرتی ہے، تب کہیں جا کر استخلاف فی الارض کا رتبہ بندگانِ خدا کو عطا ہوتا ہے۔

یہ طریق کار لمبا ہے۔ آج کل کے انقلابوں اور خونی طوفانوں سے اثر پذیر ذہن عجلت پسند ہو گئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کسی بھی طرح کام ہو، جو کچھ ہونا ہے جلدی ہو جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ چھوٹا سا ایک مقررہ ٹائم ٹیبل ہو کر دس بیس سال میں غلبۂ حق ہو جانا چاہیے۔

دوسرا بھی ایک راستہ ہے ضرور، مگر تاریخ میں وہ اتفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی کبھار ایسے سلاطین نمودار ہوتے رہے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے یہ سعادت دی کہ وہ اپنی قوت سے کام لے کر اسلام کا امکانی حد تک احیا کریں، یا بندگانِ خدا کو عادلانہ اور رفاہی طریقوں سے فیض پہنچائیں۔ بسا اوقات بہ غیر معمولی صورت ایسے حالات میں واقع ہوئی کہ عرصہ دراز تک لوگوں پر حق و صداقت کے راستے بند رہے اور تاریکی اتنی گہری ہو گئی کہ روشنی کا ذوق بھی ختم ہونے لگا۔ کبھی ایسا ہوا کہ مظلومیت اور مایوسی کا دور گزارنے والی کسی قوم کے لیے بہتری کی صورت پیدا کی۔ کبھی حالات کا نقشہ ایسا بن گیا کہ قوم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے اور بے شمار لیڈر طرح طرح کی بولیاں بولتے ہیں، مگر نہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا ہے جو ساری قوم کو پکار کر اپنے گرد سمیٹ سکے اور اس کی قافلہ سالاری کرے، اور نہ یہی ممکن ہے کہ سارے لیڈر مفاد پرستی کے چکر سے نکل کر خیر و فلاح کے نکات پر جمع ہو

سکیں۔ ایسی صورت میں مشیت غیر معمولی طریق سے کسی بہتر آدمی کو آگے کر دیتی ہے۔

مثالیں بہت ہیں۔ انبیاء میں سے صرف ایک ہی مثال سیدنا یوسف علیہ السلام کی لی جا سکتی ہے۔ قدیم سلاطین میں سے قرآن نے ذوالقرنین کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اُس کی عدل پسندی اور رفاہِ عامہ سے دلچسپی واضح ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں سیدنا عمر بن عبدالعزیز شدید بگاڑ کے بعد بنو امیہ کے سلسلۂ سلاطین میں سے ہی اُبھرتے ہیں، مگر اپنے آپ کو فوراً خلفائے راشدین کا متبع بنا کر احیائے دین اور خدمتِ انسانیت کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ پھر اگر سلطان صلاح الدین کے زمانے کے حالات دیکھے جائیں کہ مسلم معاشرہ حروبِ صلیبیہ کے باوجود داخلی انتشار سے دوچار تھا تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس شخص نے کس طرح صلیبی معرکوں کے خلاف ایک جانباز سپاہی کا فرض بھی ادا کیا اور خود مسلمانوں کے اندر ابھرنے والی بعض افتراقی قوتوں کو بھی سامنے کے ساتھ کچلا۔ اس شخص نے اقتدار کا پارٹ جس درویشی سے اعلیٰ درجہ کے معیار کے مطابق ادا کیا ہے وہ ہماری تاریخ کو روشن کرنے کا سبب ہے۔

اسی طرح تاتاریوں کی تاخت و تاراج کے آخری دَور میں مصر سے ایک غلام زادہ سلطان بیبرس جس شان سے اُبھرتا ہے اور مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو از سر نو توانائی دیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مُردوں کو زندہ کر دیا جائے۔ اس شخص نے تاتاریوں کو بے بس کر دیا، اور اسلامی اقتدار کا احیا کیا۔ اور برصغیر میں متعدد مثالوں میں سے روشن ترین مثال اورنگ عالمگیرؒ کی ہے۔ بادشاہت کے اور بگاڑ تو جو کچھ تھے وہ تھے، مگر اکبری دَور نے تو اسلام کے عقاید و احکام سے لے کر آداب و شعائر تک ہر چیز کو بُری طرح کچلا اور اسلامی تہذیب کے پامال کردہ اجزا کو ہندو قوم کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس تباہ کن دَور کی خرابیوں کا کچھ ازالہ ہمایوں نے کیا، مگر مثبت پہلو سے یہ شرف اورنگ زیب عالمگیر ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ہندوؤں کو کسی تعصب کا نشانہ بنائے بغیر اسلامی قانون اور اسلامی تہذیب کا ممکن حد تک پوری طرح نفاذ کیا۔

اس قسم کے ادوار جو بعض شخصیتوں کے ذاتی کارنامے کے طور پہ تاریخ میں اُبھرے وہ اپنی روشنی پھیلا کر جب مٹے تو ایسے مٹے کہ بعد میں وہ رنگ ڈھنگ جاری نہ رہ سکا۔ تحریکی عمل اور شخصیتوں کے کام میں یہی فرق ہے۔

یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شخصی اقتدار سے کام لے کر جن ہستیوں نے اسلام کو رائج کیا یا جن سلاطین نے عدل اور خدمتِ عوام کی اعلیٰ مثالیں چھوڑیں، ان کا بھی ایک خاص طریق کار تھا۔ وہ حضرات اگر اس طریقِ کار کو اختیار نہ کرتے تو کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ اس طریقِ کار کی چند اصولی باتیں عرض کرتا ہوں۔

۱۔ شخصی اقتدار چلانے کے لیے ویسے بھی کچھ زیادہ ہی مضبوط قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور انقلابی کام کرنے یا اصلاح و فلاح کے اُمور کو انجام دینے اور منکرات کو مٹانے کے لیے بڑا آہنی عزم درکار ہوتا ہے۔ کوئی ڈھلمل آدمی، جس نے مطالعہ اور گہرے تفکر سے ایک وسیع ذہنی پس منظر مہیا نہ کیا ہو، بلکہ چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھنے والے افراد کی مرضیات کے ردّ و قبول میں پڑا رہے، قوتِ فیصلہ کو ضائع کر بیٹھتا ہے۔

۲۔ عام فلاحی و تعمیری پروگرام میں ایک حد تک، اور اسلام میں بطور خاص معاملات کو طے کرنے کے لیے سند، معیار اور اسوہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ معیار یا نمونہ پیشِ نظر ہو تو اس پر نگاہیں جما کر بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا چیز کرنی لازم ہے اور کس چیز کا انسداد ضروری ہے۔ جہاں نہ سند ہو، نہ معیار، نہ اسوہ، وہاں کبھی کوئی ایک رائے خوشنما لگے گی اور کبھی کوئی دوسرا مشورہ من موہنا محسوس ہوگا۔

۳۔ تاریخ میں تن تنہا اُٹھ کر خدمتِ اسلام کرنے یا عدل و انصاف کا سکہ چلانے والے اصحاب کے لائحہ عمل میں مجرموں کی سرکوبی اور اس کے لیے تیز رفتار کارروائی (QUICK ACTION[1]) کا اصول بڑی اہمیت سے شامل رہا ہے۔ کسی نے بغاوت کے لیے جونہی سر اُٹھایا تو حکومت کی قوت اس کی گردن ناپنے کو موجود۔ کسی نے فساد فی الارض کا ارتکاب کیا تو اقتدار اس کے پیچھے سے بھی اور اس کے سامنے سے بھی سرکوبی کے لیے برسرِ عمل۔

۴۔ جہاں رعایا کی پریشانی اور عوام کے کسی اضطراب کی اطلاع ملی، بلا تاخیر حکمران کا دستِ شفقت اُن کے سروں پر پہنچ کر تسکین کا سامان بن جاتا ہے۔

۵۔ سب سے اہم امر یہ ہے کہ درباریوں یا مشیروں یا کارندوں میں سے اگر فرمانروا کو کسی کے متعلق یہ اندازہ ہو گیا کہ اُس نے منشائے حکومت کے خلاف کوئی اقدام کیا، یا کسی پالیسی کا رُخ ذرا سا بدل کر اُسے عوام کے لیے وجہِ پریشانی بنا دیا ہے، یا کوئی غلط مشورہ دیا ہے اور غلط منصوبہ منوایا ہے، یا اُس نے غلط کار ملازموں یا مجرم شہریوں میں سے کسی کی پشت پناہی کی ہے یا کسی کو اپنی اوٹ میں لیا ہے تو پھر بلا رو رعایت اُسے اُٹھا کے ایک طرف پھینک دیا جاتا تھا، اور بالعموم عبرت ناک سزا بھی دی جاتی تھی۔

---

[1] یہاں ایک مؤثر پنجابی محاورہ نقل کرنا مفید ہوگا: "چلیا نئیں کہ سلیا نئیں" (مراد یہ کہ جونہی کسی سانپ نے ذرا جنبش کی، نیزے یا تکلے سے اُسے فوراً چھید دیا)۔

سلاطینِ عادل کی کامیابی کا ایک راز ان کی مردم شناسی میں پنہاں ہے۔ وہ کام کے آدمیوں اور قابل اعتماد مشیروں اور بصیرت مند درباریوں کا صحیح انتخاب کرتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں جو اُن کے اختیار کردہ لائحہ عمل کو کامیاب کرنے اور ان کے طے کردہ مقاصد کو دل و جان سے حاصل کرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔

یہ چند ضروری شرائط اگر پوری نہ ہوں تو تاریخ کی گواہی یہی ہے کہ اچھے سے اچھے مقاصد رکھنے والی شخصیتیں بھی ناکام ہو گئیں۔

تاریخ کے بہت ہی پیچیدہ اور لاینحل حالات میں مشیت اس قسم کے خصوصی انتظامات کرتی رہتی ہے تاکہ انسانیت بالکل غارت ہو کر نہ رہ جائے، لوگ بالکل معطل اور بے جان نہ ہو جائیں، ان کا یقین حق و انصاف سے نہ اٹھ جائے اور وہ دعوت اسلامی کی علمبرداری کے قابل ہی نہ رہیں۔

قدرت کے اس خصوصی انتظام میں ایک ہی اساسی کلیہ واجب القبول ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی بھی سچے مسلمان کو مخصوص حالات کے تحت اقتدار کی باگ ڈور سونپ دی جائے تو اُس کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ حاصل شدہ قوت کو خدا اور رسول کے احکام و حدود سے منحرف ہو کر استعمال کرے اور ساری قوت کو اپنے مفاد و آرام کا ذریعہ بنا لے، بلکہ اس کا لازمی فریضہ یہ ہے کہ وہ دین کا علم حاصل کرے، اس کے احکام کے مطابق اقتدار کو دعوتِ دین کے فروغ، بندگانِ خدا کی اخلاقی اور معاشی فلاح، ان کو منکرات اور جرائم سے نجات دلانے اور ایک ایسی فعال، متحرک اور منظم ملت اسلامیہ میں بدلنے کی کوشش کرے جو اقامتِ دین کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے قابل ہو اور دنیا بھر کے انسانوں کے سامنے دین مبین کی صداقت کی گواہی دے سکے۔

ہاں ایسے مسلمان کو اس امر کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ اگر وہ اسلام کی برتری کے عزائم ظاہر کرتا ہے اور خرابیوں کی بیخ کنی اور ظالموں کی سرکوبی اور فواحش و منکرات کے انسداد کا اعلان کرتا ہے، وہ اگر اقامت صلوٰۃ یا ایتائے زکوٰۃ، یا کسی دوسری تعمیری یا اخلاقی اسکیم کو سامنے لاتا ہے تو اُسے اپنے دعووں کو پورا کر کے دکھانا چاہیے، ورنہ اگر اس کی ہر بات معاشرے کے فاسد عناصر کے سامنے ایک ڈھیلی ڈھالی سفارش بن کر رہ گئی اور اس کی شخصیت بے وزن ہو کر رہ گئی تو یہ کمزوری خود اسلام اور اس کے مقاصد کے لیے نقصان دہ ہو گی، اور اگر کسی دوسرے طریقے سے کام کرنے والے لوگ اُس کے لیے کام کر رہے ہوں گے یا کرنا چاہیں گے تو ان کا جادۂ سعی زیادہ کٹھن ہو جائے گا۔

اسلام خدا کی طرف سے بندوں کے لیے ایک سفارش یا نعوذ باللہ ایک گذارش نہیں ہے، وہ فرمان و ہدایت ہے۔ پس خدا کے جو بندے خدا کے دین کے لیے کام کرنے چلے ہوں وہ احکام دین کو سفارش یا گذارش بنا کے پیش نہ کریں۔ کوئی کام اگر کرنے کا ہے اور اس کے کرنے کی قوت حاصل ہے تو جرأت مردانہ سے اُسے کر ڈالیں، اور قوت حاصل نہیں ہے تو پھر دعوتِ دین کے ابتدائی مراحل طے کر کے قوت حاصل کرنے کی فکر کریں۔

تاریخ کے جھروکے میں سے جھانک کر مناظر رفتہ کو دیکھتے ہوئے کچھ اسباق جو اپنے ذہن نے اخذ کیے، بیان کر دیے گئے ہیں۔

لیکن جہاں تک جماعت اسلامی کا معاملہ ہے، وہ کسی بھی حکومت کے اچھے عزائم، دینی رجحانات اور فلاحی و تعمیری پروگراموں کو سراہتے ہوئے، خود اپنے لیے اسی طریق کار کو صحیح سمجھتی ہے جو اقامتِ دین کا فطری طریق کار ہے۔ یعنی لوگوں کو خدا کے دین کی دعوت دیتے رہنا ہے، جو اسے قبول کریں ان کو منظم کرنا، جو لوگ منظم ہوں ان کی تربیت کرنا ہے، اور اس طرح جو قوت تیار ہوتی جائے اُسے فروغ دعوت کی مہم میں شریک کرنا ہے اور اُس کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی کی ایک تحریک کو موجزن کرنا ہے۔ بحمداللہ کہ اس کام کا تسلسل کبھی نہ ٹوٹا ہے، نہ ان شاء اللہ ٹوٹے گا۔

اس دوران میں اگر ایک ایسی قوت نمودار ہوئی ہے جس نے ظلم و خیانت کے شش سالہ دور کو ختم کر دیا، اور اچھے عزائم رکھتی ہے، اور شدید مزاحمتوں اور پیچیدگیوں کے باوجود اسلام کی خدمت کا دم بھرتی ہے تو ہم اس کے لیے جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ دُعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے مختصر دور میں کچھ اچھے اور مفید اقدامات کر سکے۔

ساتھ ہی ہم اپنے آپ کو اس مغالطے میں نہیں ڈال سکتے کہ ہماری دعوتی و تحریکی ذمہ داریاں ختم ہو گئیں ہیں۔ یہ معاشرہ جس میں چوری چکاری ہے، فحاشی و عیاشی ہے، رشوت و خیانت ہے، مار دھاڑ ہے، غنڈہ گردی اور مردم آزاری ہے، نفع اندوزی اور گراں بازاری ہے، تفرقہ پسندی اور محاذ آرائی ہے، جہالت اور غلاظت ہے، قانون شکنی اور بے ضابطگی ہے، اس کا ہمہ جہتی بگاڑ ایسا نہیں کہ عوامی دائروں میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر دعوتِ اصلاح کی ضرورت ختم ہو چکی ہو۔ بلکہ حالات گواہی دے رہے ہیں کہ یہ ضرورت اُس سے کہیں زیادہ ہے، جتنی ہم سمجھتے تھے۔

میرا منشا یہ ہے کہ دین سے محبت رکھنے والوں میں جتنا بھرپور احساس ذمہ داری ہونا چاہیے اور برسرِ عمل رہے اور اس کے زیرِ اثر جو کام ہونا چاہیے وہ صبر و سکون سے جاری رہے۔